جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
کراتشی ہ پاکستان

جامعہ علوم اسلامیہ - پوسٹ بکس نمبر ۳۴۶۵ جمشید روڈ کراچی - www.banuri.edu.pk

بینات
جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراتشی ہ پاکستان

’’دینیات‘‘علم الکلام کا ایک نہایت ضروری باب

’’دینیات‘‘
علم الکلام کا ایک نہایت ضروری باب

دینی علوم وفنون میں ایک اہم اور بنیادی علم ’’علم الکلام‘‘ ہے ،جس کو ’’علم التوحید‘‘، ’’علم الأسماء والصفات‘‘ ، ’’علم أصول الدین‘‘ ،اور ’’علم العقائد‘‘ وغیرہ ناموں سے بھی جانا جاتا ہے ، دیگر تمام اہم علوم وفنون کی طرح اس علم کی بھی ایک ارتقائی تاریخ ہے ، جو علمِ کلام کی مفصل کتابوں میں اور علمِ کلام کے ساتھ شغف رکھنے والے حضرات اہلِ علم کی تحریرات وتالیفات میں تفصیل کے ساتھ درج ہوتی ہے ۔ اس علم کا بنیادی مقصود یہ تھا کہ قرآن وسنت میں جن عقائد کا ذکر کیا گیا ہے ، ان کی حقانیت پر پوری طرح ایمان لایا جائے ، معاصرانہ اسلوب کے مطابق اس کو درجۂ تحقیق وثبوت تک پہنچایا جائے اور ان اعتقادی نصوص پر وارد ہونے والے اشکالات وشبہات کا تسلی بخش جواب دے کر عام مسلمانوں کے دین وایمان کی اچھی طرح حفاظت کی جائے ۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سوال وجواب کے انداز میں اس علم کی اہمیت اور اس کی اساس وبنیاد سمجھاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

’’فإن قلت: فلم صار من فروض الکفایات وقد ذکرت أن أکثر الفرق یضرہم ذٰلک ولا ینفعہم؟ فاعلم أنہ قد سبق أن إزالۃ الشکوک في أصول العقائد واجبۃ، واعتوار الشک غیر مستحیل وإن کان لا یقع إلا في الأقل، ثم الدعوۃ إلی الحق بالبرہان مہمۃ فی الدین، ثم لا یبعد أن یثور مبتدع

ويتصدى لإغواء أہل الحق بإفاضۃ الشبہۃ فيہم، فلا بد ممن يقاوم شبہتہٗ بالكشف ويعارض إغواء ه بالتقبيح، ولا يمكن ذٰلک إلا بہٰذا العلم۔ ولا تنفک البلاد عن أمثال ہٰذه الوقائع، فوجب أن يكون في كل قطر من الأقطار وصقع من الأصقاع قائم بالحق مشتغل بہٰذا العلم يقاوم دعاۃ المبتدعۃ ويستميل المائلين عن الحق ويصفي قلوب أہل السنۃ عن عوارض الشبہۃ، فلو خلا عنہ القطر خرج بہ أہل القطر كافۃ، كما لو خلا عن الطبيب والفقيہ۔''(۱)

ترجمہ : ''علم کلام کا سیکھنا کیوں فرض کفایہ ہے؟ حالانکہ اکثر لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے؟ واضح رہے کہ پہلے گزر چکا کہ عقائد میں شبہات سے بچنا ضروری ہے اور شک - اگرچہ بہت کم ہی کیوں نہ ہو - پیش آنا ناممکن نہیں، اسی طرح دلیل کی بنیاد پر حق کی طرف دعوت دینا بھی ایک اہم دینی ذمہ داری ہے اور ممکن ہے کہ کوئی بدعتی اُٹھ کھڑا ہو کر اہلِ حق کے دلوں میں شبہات ڈالے اور انہیں گمراہ کرنے کی ٹھان لے، لہٰذا ایسے افراد کی موجودگی ضروری ہے جو اس کا شبہ دور کرکے دلائل کے ساتھ اس کی گمراہی واضح کریں اور یہ علم کلام کے بغیر ممکن نہیں۔ اکثر شہروں میں اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں، لہٰذا ہر جگہ ایسے افراد کی موجودگی ضروری ہے، جو حق پر قائم رہ کر اس علم کو سیکھیں اور حق سے اعراض کرنے والے اور اہلِ بدعت کا مقابلہ کرکے اُنہیں حق کی طرف راغب کریں، اہلِ سنت کے دلوں کو شبہات سے محفوظ رکھ سکیں، ورنہ اگر کوئی جگہ اس قسم کے لوگوں سے خالی ہوجائے تو اہلِ باطل کا وہاں غلبہ ہوگا، جیسا کہ کوئی علاقہ فقیہ اور ڈاکٹر سے خالی ہوجائے۔''

شیخ عبد اللطیف خربوتی رحمۃ اللہ علیہ علمِ کلام کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''ہي الترقي من حضيض التقليد إلى ذروۃ اليقين وإرشاد المسترشدين وإلزام المعاندين وحفظ عقائد المسلمين عن شبہ المبطلين۔''(۲)

ترجمہ : ''علمِ کلام کا مقصد تقلید کی پستیوں سے یقین کی بلندیوں کی طرف بڑھنا، حق طلب کرنے والوں کی رہنمائی کرنا، مخالفین کو لاجواب کرنا اور مسلمانوں کے عقائد کو گمراہ لوگوں کے شبہات سے بچانا ہے۔''

علامہ مرعشی مرحوم علم کلام کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''وأما علم الكلام: ويسمى أيضا علم أصول الدين، فہو علم يقتدر بہ على إثبات العقائد الدينيۃ بإيراد الحجج عليہا ورفع الشبہ عنہا۔''(۳)

ترجمہ : ''علم کلام جسے علم اصول الدین بھی کہا جاتا ہے، ایسا علم ہے جس کے ذریعے دینی عقائد کو دلائل سے ثابت کرنے اور عقائد سے متعلق شبہات کو زائل کرنے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔''

سلفِ صالحین کے ابتدائی دور میں نقل ہی کا رواج تھا تو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ اس وقت عقائدِ اسلامیہ کو قرآن وسنت کی نصوص کے ذریعہ ہی ثابت کرنے پر قناعت فرماتے رہے۔ مثال کے طور پر جب عقیدۂ ''تقدیر'' کے متعلق بعض لوگوں نے اسلامی عقیدے کے خلاف موقف اپنا کر اس کی تبلیغ شروع کی اور اس کی اطلاع صحابی جلیل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو پہنچی تو انہوں نے انکار کرنے والے سے براءت وناراضگی کا اظہار فرمایا اور پھر احادیثِ مبارکہ سے استدلال کرکے اس اعتقاد کی حقانیت وضرورت کو ثابت فرمایا۔ اسی طرح حضرت جابرؓ وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی مختلف اعتقادی مسائل میں یہی طرز اپنایا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد یونانی فلسفہ کی آمد اور عجمی دماغ لوگوں کے بکثرت مسلمان ہونے کی وجہ سے عقلیات کا دور دورہ شروع ہوا اور دینی عقائد کو عقل کے ناتمام ترازو سے تولا جانے لگا، دیکھتے ہی دیکھتے ایک یلغار سی شروع ہوئی اور کسی بھی خیال واعتقاد کی صداقت وحقانیت کا یہی معیار ٹھہرا تو اس وقت کے علماء راسخین نے اسی پہلو سے عقائدِ اسلامیہ کے دفاع کی کوشش فرمائی، جن میں وہ بڑی حد تک کامیاب وکامران ثابت ہوئے۔ تاریخ کے اوراق میں انہی حضرات کو متکلمین کے نام وخطاب سے جانا جاتا ہے۔ اس گلستانِ حکمت ودانائی میں امام غزالی، امام صابونی، امام رازی، علامہ آمدی، علامہ نسفی، علامہ عضد الدین ایجی، تفتازانی، علامہ میر سید شریف جرجانی، علامہ سبکی، اور علامہ سنوسی ولَقانی وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم روشن قندیلیں ہیں، جن کی خوشبوؤں سے ہمیشہ عالمِ اسلام کو تر وتازگی نصیب ہوتی رہی۔

ان حضرات کا غایت مقصود یہ تھا کہ قرآن وسنت کی نصوص میں جن اعتقادات کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی حقانیت وصداقت ثابت کی جائے اور معاصرانہ مزاج کے اشکالات وشبہات سے اس کا کماحقہٗ دفاع کیا جائے، اس مقصود کی تکمیل کے لیے اس زمانہ کے رسم وطبیعت کے مطابق عقلیات میں مہارت بھی ضروری تھی اور افہام وتفہیم، بحث ومکالمہ میں اس عقلی طرزِ استدلال کا بروئے کار لانا بھی لازم تھا، ان دونوں باتوں کے بغیر کسی بات کی طرف اعتماد کی آنکھیں نہیں اُٹھتی تھیں، اس لیے ان حضرات نے اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے عقلیات میں بھی مہارت پیدا کرنے کی پوری کوشش فرمائی اور ساتھ اپنی تصنیفات وتالیفات کو بھی اسی قالب میں ڈھالا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مساعی حصنِ حصین (مضبوط قلعہ) ثابت ہوئیں اور اعتقادی میدان میں ہونے والے تمام حملوں سے عقائدِ اسلامیہ کی عمارت پوری طرح محفوظ وسالم رہی۔ اسباب کی دنیا میں ان حضرات کے خلوصِ دل، کمالِ عقل اور سر توڑ محنت وکوشش ہی کا نتیجہ تھا کہ عقلیات کی اس طوفانی یورش میں بھی عقائدِ اسلامیہ پر کوئی حرف نہیں آیا، بعد میں صدیوں تک یلغار کی یہی صورت جاری رہی اور انہی حضرات متکلمین کی محنتیں سدّ سکندری بن کر مانع رہیں۔

اس کے صدیوں بعد ماضی قریب میں ''اِلحاد'' و ''تجدد پسندی'' کا سیلاب پھوٹنا شروع ہوا اور علم، سائنس، تجربہ وطبیعت کے عنوان سے ایک بار پھر عقائدِ اسلامیہ پر ہر طرف سے تابڑ توڑ حملے شروع ہوئے، پہلے کی بنسبت ان حملوں میں واقعیت تو بہت کم تھی، لیکن رنگ وروغن بہت تھا، جس کی وجہ سے یہ فتنہ خوب منقش ومزین ہو کر افرادِ امت کے سامنے نمودار ہوا اور نمودار بھی ایسی حالت میں ہوا جبکہ افرادِ امت کے دل ودماغ میں اپنے اسلاف کی طرح دین وایمان کے چراغ برقرار نہ رہے تھے، نہ ہی دین وایمان کی وہ فضائیں باقی رہی تھیں جن کی روشنی میں بے بصیرت وبے طلب لوگ بھی راہِ راست کو تھام کر اس پر جم جاتے تھے۔ ایک طرف شکاری کی مہارت ہو اور دوسری طرف ہرن کا لنگڑا پن! نتیجہ یہی ہوا کہ کچھ ہی عرصہ میں سینکڑوں ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں آدمیوں کے پاؤں ڈگمگا کر اس سیلِ رواں میں بہہ کر بھٹکنا شروع ہوئے اور تاہنوز اس کا سلسلہ پوری شدت وحدّت سے جاری ہے۔

اس حالیہ فتنے اور قدیم دور کے فتنوں میں ایک بڑا مابہ الفرق یہ بھی ہے کہ قدیم فتنے کا اشکال صرف اعتقادیات کے بعض مسائل پر ہوتا تھا اور اس کے پس پشت بھی کچھ نہ کچھ دین داری، دیانت داری کا جذبہ موجزن ہوتا تھا، چنانچہ بہت مرتبہ معترض اگر اعتراض کرتا بھی تھا، تو حاصلِ اعتراض یہی ہوتا تھا کہ فلاں مسئلہ کی تعبیر وتشریح بدل دی جائے یا کسی تاویل کا راستہ اپنایا جائے، جبکہ موجودہ دور کے فتنوں میں یہ دونوں باتیں عنقاء ہیں، چنانچہ اس حالیہ فتنے کے اشکالات وشبہات صرف کسی خاص مسئلے یا چند ابواب تک محدود نہیں ہیں، بلکہ دینِ حق کے کلی نظام پر اُس کی زَد پڑتی ہے اور عموماً ان اشکالات کی بنیاد کوئی دینی جذبہ یا اسلامی خیر خواہی نہیں ہوتی، بلکہ اکثر مشاہدہ یہی بتاتا ہے کہ بے دینی اور بے راہ روی ہی اس کا باعث بن جاتا ہے اور یہی اس کی بقاء واستمرار کا سبب ہے، چنانچہ اب کے اشکال کرنے والے کا مطالبہ تعبیر وتشریح کی تبدیلی کا نہیں ہے، بلکہ دین کی حیثیت تبدیل کرنا مقصود ہوتا ہے۔

یلغار کے اس تغیُّر اور دشمن کے پینترا بدلنے کی وجہ سے علمِ کلام کے وسیع اور رنگا رنگ میدان میں ایک نئے باب کے اضافے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے، جو پہلے متکلمین کے کچھ نہ کچھ پیشِ نظر ضرور تھا، لیکن اُن کے زمانے میں اس باب کی کوئی خاص ایسی ضرورت نہیں تھی، جیسی آج کل ہے، جبکہ ضرورت ہی ایجاد والتفات کی ماں اور اس کا باعث قرار پاتی ہے، اس لیے علمِ کلام کی قدیم کتابوں میں مستقل باب وعنوان کی حیثیت سے اس کو رواج نہیں ملا، وہ باب ہے ''دین اور اس سے متعلق عصری اشکالات واعتراضات'' کا، جن کو ہم مختصراً ''دینیات'' کا نام دے سکتے ہیں، جس کے مثلاً یہ مضامین اور عنوانات ہوسکتے ہیں:

۱:- دین کا مفہوم ومصداق کیا ہے؟

۲:-اس کی حیثیت و نوعیت کیا ہے؟ کیا ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ ضرور کسی دین کو گلے لگائے یا یہ ایک اختیاری معاملہ ہے؟ اگر ضروری ہے تو کسی خاص دین کو سوفیصد اختیار کرنا لازم ہے یا کسی بھی دینِ سماوی کو اپنانا نجات کے لیے کافی ہے؟ خاص دینِ اسلام کو اختیار کرنے کی کیا وجہ ہے؟

۳:-مقصودیتِ دین کہ دین کہ خود مقصود ہے یا کسی دوسری چیز کا ذریعہ؟ دنیوی ترقی اور قیامِ امن وامان مقصود ہے یا دینی احکام کی تابعداری؟

۴:-جامعیت و کاملیتِ دین: دین' انسان اور اس کے خالق کے درمیان خاص تعلق وربط کا نام ہے یا انسانوں کے باہمی معاملات میں بھی دین کا کوئی لازمی پہلو ہوسکتا ہے؟ اسی طرح حکومت وسیاست کے مجال میں بھی اس کا کوئی عمل دخل ہوسکتا ہے یا وہاں تک دین ومذہب کی رسائی نہیں ہوسکتی؟

۵:-ابدیتِ دین: دین کی تابعداری کب تک ضروری ہے؟ جو لوگ دینی نصوص واحکام کے اصل مخاطب ہوں، وہی اس دین کو اپنانے کے پابند ہیں یا قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لیے یہ حکم ہے؟ صدیوں پہلے کے عرف ومعاشرے میں جو دین نازل ہوا تھا، آج کے دور میں وہ دین قابلِ نفاذ اور قابلِ عمل بھی ہے یا نہیں؟

۶:-دین کا مقام ومرتبہ، وغیرہ۔

علمِ کلام کے مقاصد واغراض کو اگر ایک نظر پھر تازہ کر لیا جائے تو واضح ہوجائے گا کہ ان جیسے مباحث کو حل کرنا اور ان کے متعلق عصری شبہات کو تسلی بخش طریقے سے دفع کر کے مسلمانوں کے متاعِ دین وایمان کو ان کی گمراہیوں سے بچائے رکھنا عصری ''علمِ کلام'' کا اہم اور ضروری حصہ ہے، جو معاصر متکلمین حضرات کی بھاری ذمہ داری ہے۔

قدیم علمِ کلام میں مقاصد کی حیثیت سے عموماً تین ہی مباحث سے زیادہ بحث ہوتی ہے: ۱:-الٰہیات، ۲:- نبوات، ۳:-سمعیات۔ علم کلام کی مفصل کتابوں میں بھی ''دینیات'' کا کوئی مستقل باب نہیں ملتا۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان حضرات کے زمانوں میں اس کی ضرورت ہی نہیں تھی، دینیات سے متعلق جو کچھ نکات ابھی درج کیے گئے اور جن سے متعلق آج ایک جہاں گمراہی اور بے راہ روی کی دلدل میں پھنس رہا ہے، متکلمین کے زمانے میں فریقین (موافق ومخالف) کے ہاں مسلم اور بدیہی کی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے خواہ مخواہ ان باتوں کی طرف تعرُّض کرنے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی اور اسی بنیاد پر علم کلام کی کتابوں میں ان مباحث کو کوئی مستقل جگہ نہیں مل سکی۔

لیکن اب جبکہ علم کلام کے تینوں ابواب (الٰہیات، نبوات، سمعیات) کی بنسبت اسی باب (دینیات) میں زیادہ تر گمراہیاں جنم لیتی ہیں اور دین کا جو تصور قرآن وسنت کی پاکیزہ نصوص سے نکھر کر سامنے آتا ہے، اس مفہوم کو تسلیم کرنے سے انکار وانحراف کیا جاتا ہے اور اسی سے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کیے جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ سابقہ متکلمین حضرات کی محنت وطریقہ کار سے روشنی لیتے ہوئے اور ان کی اتباع کرتے ہوئے ان عصری فتنوں سے دینِ اسلام کی حفاظت کی جائے اور اس باب میں اپنی ممکنہ طاقت وصلاحیت صرف کی جائے۔

عقلِ انسانی کے بالغ ہوجانے کے بعد شاید کسی دور میں اس شدت وتسلسل کے ساتھ دین کی حقیقت ومفہوم، حیثیت ونوعیت، ضرورت واہمیت اور اس کے مقام ومرتبہ کو ڈھا کر ختم کرنے اور ملیامیٹ کرنے کی اتنی اور اس قسم کی جان گداز کوششیں کی گئی ہوں جو ترقی وٹیکنالوجی کے اس دور میں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ بلاشبہ ہر دور میں دینِ حق کے ہزاروں منکر وحاسد گزرے ہیں، لیکن مطلق دین کی وقعت وحیثیت کے خلاف جتنی شورش آج مشرق ومغرب میں ہورہی ہے، وہ کسی دور میں نہ ہوئی، اس لیے آج کے علمِ کلام اور اس فن میں مہارت رکھنے والے گراں قدر متکلمین حضرات کا فریضہ صرف یہی نہیں ہے کہ قدیم علمِ کلام کی کتابوں میں درج شدہ تین مباحث میں مہارت پیدا کرنے پر اکتفاء کریں اور اسی کے دفاع کرنے پر قناعت فرمائیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بلکہ شاید اس سے کچھ زیادہ اہم فرضِ منصبی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ''دینیات'' سے

متعلق اس معاصر فتنے کا مقابلہ فرمائیں اور اس کی تند و تیز موجوں سے دینِ حق کے در و دیوار محفوظ رکھنے میں اپنا زورِ بازو اور ہمت صرف فرمائیں۔ اگر کوئی خوش نصیب یہ بھاری ذمہ داری پوری طرح نبھانے کے لیے میدان میں آجائے اور خلوصِ دل اور سلامتِ فکر کے ساتھ اس موضوع پر معاصر دنیا کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرے تو علمِ کلام کے میدان میں یہ اس کی بہت بڑی خدمت متصور ہوگی۔

حوالہ جات

۱:-الاقتصاد فی الاعتقاد، ص: ۱۶

۲:- تنقیح الکلام فی عقائد اہل الاسلام، المقدمۃ، البحث الاول، ص: ۱۱

۳:-ترتیب العلوم للمرعشی، ص: ۱۴۳